صحیح راہ پر ڈالا جا سکے گا ورنہ حوادث و تغیرات کے تنوّع و تلاطم کی زد میں آنے والی دنیا محدود دروس قرآن سے مستفیض ہونے کا وسیع موقع نہ پا سکے گی اور یوں دعوت رجوع الی القرآن کے لئے ہمہ جہت اثرات اور ہمہ گیر انقلاب پیدا کرنا مشکل ہو جائے گا۔

فاضل مصنف نے مہجوریٔ قرآن کی جس داستانِ الم کی طرف متوجہ کیا ہے اس کے اسباب نتائج اور اثرات کے لئے صفحات و ابواب نہیں بلکہ اجزاء و مجلّدات درکار ہیں مگر مجھ جیسے کم علم و بے بضاعت کے پاس حکیم الامت کے اس ارشادِ درد انگیز کے سوا کہنے کو یا لکھنے کو کچھ نہیں کہ:

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا   کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا!

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنی اس محبوب ترین تحریر میں جو خوبصورت ترین بات کہی ہے وہ تحریک اسلامی کے دوسرے ستون یعنی عملی تطبیق کے نبوی طریق کار یا جہاد فی سبیل اللہ کی اقسام کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش ہے' جہاد فی سبیل اللہ سے عموماً اور اکثر و بیشتر ایک محدود سی قسم یعنی قتال فی سبیل اللہ یا زبان نبوت میں جہاد اصغر مراد لیا جاتا ہے لیکن یہ سمجھنے سمجھانے کی کوشش نہیں کی گئی کہ نبوی طریق کار یا جہاد فی سبیل اللہ کے کئی ابعاد و اقسام ہیں' پہلی قسم لسان نبوت میں افضل الجہاد کی ہے اور یہ انسان کا اپنے نفس امّارہ بالسوء کے خلاف جہاد ہے' تزکیہ نفس اور تعمیر شخصیت یا دوسرے لفظوں میں سیرت سازی کا یہ مرحلہ خشت اول کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر یہی ٹیڑھی ہو تو اوج ثریا تک جانے والی دیوار جہاد بھی ٹیڑھی رہ جائے گی' جہاد فی سبیل اللہ کا دوسرا میدان جہاد اکبر کہلاتا ہے' مجاہدۃ البناء الاجتماعی یا تعمیر معاشرہ کا جہاد بڑا وسیع اور کٹھن میدان ہے' جہاد کا یہی مرحلہ نہی عن المنکر اور امر بالمعروف' دعوت و تبلیغ' خدمت خلق اور عالم بشریت کو ہلاکتوں اور آلائشوں سے نجات دلانے جیسے اہم و خوبصورت عناوین رکھتا ہے۔ امام علی المتقی رحمۃ اللہ علیہ نے "کنز العمال" میں روایت کیا ہے کہ ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کسی غزوہ سے واپس تشریف لائے اور مدینۃ النبی میں قدم رکھا تو زبان حق ترجمان پر یہ کلمات رواں تھے:

رجعنا من الجہاد الاصغر الی الجہاد الاکبر

یعنی غزوہ کے جہاد اصغر سے واپس آ گئے ہیں اب ہمارے سامنے جہاد اکبر یعنی اصلاح و

© rasailojaraid.

تعمیرِ معاشرہ کا میدان ہے‘ جہاد کا تیسرا میدان قتال فی سبیل اللہ ہے جو جہاد اصغر ہے اور قلیل الوقوع ہونے کے اعتبار سے تو جہاد اصغر ہے مگر عظیم الشان قربانی یا نذرانۂ جاں پیش کرنے کے باعث شہادت عظمیٰ کا وسیلہ ہے‘ درحقیقت یہ جہاد اکبر ہی کا ایک حصہ یا شاخ ہے یعنی وہ وقت جب منکر کے خلاف طاقت کے استعمال اور تلوار اٹھانے کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے!

نبوی طریق کار میں جہاد فی سبیل اللہ کے یہ تین نمایاں طور پر الگ اور مستقل میدان ہیں‘ مکہ مکرمہ میں دار ارقم کی تربیت گاہ اسی افضل الجہاد کی تربیت گاہ تھی جہاں نبوت کی نگرانی و رہنمائی میں تعمیر شخصیات اور سیرت سازیٔ افراد کا مہتم بالشان کام انجام پایا‘ دنیا کی تاریخ تحریک اسلامی سے قبل کے مراحل میں اس افضل الجہاد کے تربیتی مرحلہ سے قطعاناآشنا اور خاموش نظر آتی ہے اور بعد کی خوشہ چین تحریکات اپنے کارکن تیار کرنے میں نبوی طریق کار کے مقابلہ میں اپنے دیوالیہ پن کا ثبوت پیش کرتی نظر آتی ہیں‘ ہر میدان اور ہر کام کے اتنے باکمال افراد اتنی کثرت کے ساتھ اور کوئی نہ تیار کرسکا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی دار ارقم میں اور کبھی مسجد نبوی میں تیار کئے! یہ نظرِ نبوت کا فیضان و اعجاز تھا جس نے اتنے باکمال انسانوں کی جماعت تیار کرلی۔ افضل الجہاد کا یہ مرحلہ درحقیقت وہی مرحلہ ہے جس کے متعلق حکیم الامت مشورہ دیتے ہیں کہ ”بانشۂ درویشی درساز و دمادم زن“ اسی مرحلہ میں انسانی خودی اپنی پختگی کے مختلف مراحل طے کرتی ہے اور اپنے ظاہر و باطن کو عقیدہ توحید سے فولاد صفت بناتی ہے‘ تمام معبودان باطل کی نفی کرتے ہوئے ”لاموجود فی الکون الا ھو“ کا مستانہ نعرۂ توحید بلند کرنے کے قابل ہوتی ہے تو خرمن باطل جلا کر خاکستر کردیتی ہے۔ راستہ میں آنے والی ہر قوت باطل پاش پاش ہوتی جاتی ہے۔ اس مرحلہ سے گزرنے کے بعد بندۂ مومن عصا کے ساتھ کار کلیمی بھی انجام دیتا ہے اور شہادت حق کو اپنا مطلوب و مقصود ٹھہرا کر کبھی جہاد اکبر کے میدان میں سرگرم نظر آتا ہے اور کبھی جہاد اصغر کے میدان میں قوت باطل سے برسرپیکار نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ ارشاد بجا ہے کہ دعوت رجوع الی القرآن کا ایک میدان روحِ جہاد کا احیاء بھی ہے۔ بندۂ مومن کو جہاد بالنفس کی حقیقت سے روشناس کرکے اسے

(باقی صلا پر)

© rasailojaraid.com

تحریک دعوت الی القرآن

ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ

یہ مقالہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام
سالانہ محاضراتِ قرآنی (مارچ ۱۹۹۰ء)
کے موقع پر پیش کیا گیا

© rasailojaraid.com

مقصدِ خلق

اللہ تعالیٰ نے جن وانس کی تخلیق کا مقصد اپنی عبادت قرار دیا ہے:

"وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ" [۱]

"اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کریں۔"

دعوت اِلیٰ اللہ

انسان کا مقصودِ حقیقی اللہ ہے۔ دعوت اِلیٰ اللہ مقصودِ حقیقی کے حصول کا ذریعہ ہے۔ انبیاء و رُسل اس کے داعی رہے ہیں۔ یہی وہ راستہ ہے جس کی طرف دعوت دینے کے لیے سب سے آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے:

"قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ" [۲]

"کہہ دو میرا رستہ تو یہ ہے میں اللہ کی طرف دعوت دیتا ہوں (از روئے یقین اور برہان) سمجھ بوجھ کر۔ میں بھی (لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دیتا ہوں) اور میرے پیرو بھی اور اللہ پاک ہے۔ اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔"

دعوت اِلیٰ اللہ کی وجہ سے قرآن نے نبی اکرم صلعم کو داعی اِلیٰ اللہ کا لقب عطا فرمایا:

"وَدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا" [۳]

"اور اللہ کی طرف بلانے والا اور چراغ روشن۔"

---

[۱] قرآن الذٰریٰت ۵۱ : ۵۶ [۲] قرآن یوسف ۱۲ : ۱۰۸

[۳] قرآن الاحزاب ۳۳ : ۴۶

© rasailojaraid.com

جب عبادتِ الٰہی حقیقی مقصدِ حیات ہے تو اس کے مفہوم کی صحیح تعیین اور اس کے معنی اور مطلب کی صحیح تفہیم پر تحقیق اوّل ترجیح قرار پاتی ہے۔ یہ اصطلاح ایسی تعبیر نو کا تقاضا کرتی ہے جو دورِ جدید میں عقاید، عبادات، اخلاق، ریاستی امور، حکومتی معاملات، معاشرتی، معاشی، سیاسی، تہذیبی اور تمدّنی اُمور و مسائل میں اللہ کی مرکزیت کو ثابت کر دے۔

اس اعتبار سے رسمی عبادات اس وسیع اور ہمہ گیر عبادتِ الٰہی کا جز ہیں۔ حکم، حکومت اور ریاست کے جملہ امور، معاشرت، معیشت اور سیاست کے تمام معاملات، انفرادی، اجتماعی، قومی اور بین الاقوامی تعلقات و روابط کے تمام اصول و قواعد کو توحید پر استوار کرنا عبادتِ الٰہی کے مختلف پہلو ہیں:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ [۱]

"اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں۔ اس نے حکم دیا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔"

پورے معاشرتی اور معاشی نظام کو بدل کر اسے توحید کے اصولوں پر از سر نو قائم کرنا نظامِ صلوٰۃ ہے۔ اسی پر قومِ شعیبؑ نے تعجب کرتے ہوئے پوچھا تھا:

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا [۲]

"انہوں نے کہا شعیب! کیا تمہاری نماز تمہیں یہ سکھاتی ہے کہ جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ہیں ہم ان کو ترک کر دیں یا اپنے مال میں جو تصرف کرنا چاہیں تو نہ کریں۔"

تسخیرِ کائنات، انسانیت کے جملہ معاملات، اور خالق، مخلوق اور کائنات کے تعلقات کے فطری اصول دریافت کرنا اور ان کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی گذارنا عبادتِ الٰہی ہے۔

دعوت اِلَی القرآن

عبادتِ الٰہی کے اس وسیع اور ہمہ گیر تصور کو عملی جامہ پہنانے کا فطری اور سائنسی ذریعہ وہ ہدایت ہے جو قرآن میں محفوظ ہے۔ دورِ حاضر

---

[۱] قرآن سورہ یوسف ۱۲ : ۴۰

[۲] قرآن سورہ ھود ۱۱ : ۸۷

© rasailojaraid.com

میں دعوت الی القرآن کا مطلب اس فطری اور سائنسی طریقے کی دریافت اور حیات و کائنات کے جملہ امور کو اس پر استوار کرنے کے لیے لائحۂ عمل کی ترتیب ہے۔ جس کے چند اصول یہ ہیں:

۱۔ جدید سائنسی، تکنیکی، حیاتیاتی، نفسیاتی، معاشی اور جمہوری نظریات و تصوّرات کی عظمت کو مانتے ہوئے ان کے اصول و مبادیات پر تحقیق کرنا اور دیکھنا کہ وہ کس حد تک عبادتِ الٰہی کے قرآنی عقیدہ سے مطابقت رکھتے ہیں اور کس حد تک اس سے متصادم ہیں۔

۲۔ فرد، خاندان، قبیلہ، قوم کے تعلقات اور ریاستی اُمور، حکومتی معاملات، معاشرتی تعلقات کو الٰہیات کے عقاید سے جاری ہونے والی دینی، اخلاقی اور روحانی اقدار پر استوار کرنا تاکہ فرد اور معاشرے کے تعلقات اور فرد، معاشرے اور ریاست کے روابط، عبادتِ الٰہی کے عقیدے سے مربوط ہو جائیں۔

۳۔ عقاید، عبادات اور معاملات کی ایسی تعبیر نو کرنا کہ وہ ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہوں اور وہ ایک دوسرے سے متصادم اور مزاحم نہ ہوں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں اس توازن اور تناسب کو اُجاگر کرنا جسے قرآن نے "فطرت اللہ" کہا ہے:

"فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ"[۶]

"اللہ کی فطرت کو جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے (اختیار کیے رہو) اللہ کی بنائی ہوئی فطرت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔"

۴۔ گذشتہ دور کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام کے احیاء اور اس کی نشأۃ ثانیہ کی بجائے اسلام کے فطری، ابدی، سرمدی اور آفاقی اصولوں کو صاف اور کھلے انداز میں پیش کرنا تاکہ ان کی بنیاد پر نیا سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام معرض وجود میں لایا جا سکے۔ نظامِ فطرت خود ارتقاء پذیر ہے۔ کسی دور کا سیاسی نظام کیسے مستقل ہو سکتا ہے؟ ثبات فقط تغیّر کو ہے زمانے میں۔ جس نسبت سے فطرت اور معاشرت ارتقا کرتے ہیں اسی نسبت سے قرآنی اقدار کی بنیاد پر نیا نظام معرض وجود میں آنے کا تقاضا کرتا ہے۔

۵۔ قرآن کی تعلیمات کو پیش کرتے وقت اس اصول کو ملحوظ رکھنا کہ جن قرآنی تعلیمات کی ایک تعبیر ہو چکی ہے ان کی جدید تعبیر ممکن ہے اور جن تعلیمات کی تعبیر زمانہ ماضی میں خارجی تقاضوں کے

---

[۶] قرآن سورۃ الروم ۳۰ : ۳۰

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

فقدان کی وجہ سے اب تک نہیں ہوئی ان کی تعبیرِ اوّل کا خیر مقدم کرنا اور اس کی حوصلہ شکنی کی بجائے حوصلہ افزائی کرنا دعوت اِلیٰ القرآن ہے۔ قرآن ہر زمانے کے تقاضوں کے لیے ہدایت رکھتا ہے۔ یہ اس زمانے کے لوگوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے زمانے کے لیے محفوظ ہدایت کی تلاش کریں۔ گزشتہ ادوار کے رہنماؤں نے اپنے اپنے دور کے تقاضوں کے لیے ہدایت کی یہ تلاش کی تھی۔ دورِ حاضر یا مستقبل کے حالات و تقاضے ان کو درپیش نہ تھے وہ ان پر اپنے افکار کا اظہار کس طرح کرتے! قرآن کی تعلیمات غیر متبدل ہیں لیکن مختلف اعصار و امصار میں ان کی تعبیرات متبدل اور متغیّر ہیں۔ شریعت خداداد ہے، وہ غیر متبدل ہے۔ تعبیرِ شریعت انسان ساختہ ہے۔ وہ متبدل ہے۔ یہ بھی دعوت اِلی القرآن ہے کہ ابدی، حتمی، قطعی، اٹل اور غیر متبدل کو وقتی، عارضی، متبدل اور متغیر سے علیحدہ کیا جائے اور بدون لومۃ لائم شریعت کو شریعت اور تعبیرِ شریعت کو آپس میں [illegible] کیا جائے۔

میری نظر میں مندرجہ بالا اصولِ خمسہ دعوت اِلی القرآن کے عمل کو تیز تر کر سکتے ہیں۔

اجتہاد اور دعوت اِلی القرآن

ان اصولوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو دعوت الی القرآن درحقیقت اجتہاد کا دوسرا نام ہے۔

قرآن چونکہ دائمی ہدایت ہے اس لیے اجتہاد، قرآن پر عمل کا مستقل اصول ہے۔ اصولِ فقہ کا قاعدہ ہے: "تغیّر الاحکام بتغیّر الاحوال" حالات میں تبدیلی سے احکام میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ قرآن کے مطابق اللہ نے بنیادی اختیارات عوام کو تفویض کیے ہیں:

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ [۱]

"وہی تو ہے جس نے تم سب کو زمین میں نائب بنایا"

جن اختیارات کی نیابت عوام کو تفویض ہوئی ان میں تین خاص طور پر اہم ہیں۔

۱۔ اختیارِ حکمرانی

۲۔ اختیارِ قانون سازی

۳۔ اختیارِ وسائلِ معاش

خلافتِ راشدہ میں عوام ان اختیارات کے مالک تھے پھر حالات میں تبدیلی آئی۔ ملوکیت قائم ہو گئی اور ملوک و سلاطین ان اختیارات پر قابض ہو گئے۔ اور عوام ان سے محروم ہو گئے۔

---

[۱] قرآن، سورۃ الانعام ۶: ۱۶۶

© rasailojaraid.com

اب ان دونوں نظاموں کا موازنہ کیا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ دورِ خلافت میں دعوت الی القرآن کا مطلب توحید اور عبادتِ الٰہی کی بنیاد پر شریعت کی ایسی تعبیر کرنا تھا، جس کے تحت تمام حقوق و اختیارات کے مالک عوام ہوں۔ یہ فقہِ خلافت تھی جبکہ دورِ ملوکیت میں دعوت الی القرآن کا مفہوم ایسی فقہ سازی تھا جس کے تحت تمام حقوق و اختیارات کے مالک ملوک و سلاطین ہوں اور عوام سمع و طاعت کے اصول کے تحت محض فرمانبردار اور اطاعت شعار رعایا ہوں۔ یہ فقہِ ملوکیت تھی۔ اب دورِ جمہوریت ہے۔ اس میں دعوت الی القرآن کا مطلب یہ ہے کہ قرآنی تعلیمات کی ایسی تعبیرِ نو ہو جو عوام کو ان کے غصب شدہ حقوق و اختیارات بحال کرے۔ جس طرح دورِ خلافت کی تعبیرِ شریعت دورِ ملوکیت کو راس نہ آئی تھی اور اپنے قیام کے لیے اس نے فقہِ ملوکیت تیار کی تھی بالکل اسی طرح دورِ ملوکیت کی فقہِ ملوکیت دورِ جمہوریت کے لیے ناسازگار ہے۔ دورِ جمہوریت فقہِ جمہوریت کا شدید تقاضا کر رہا ہے، وہ دعوت الی القرآن کامیابی سے ہمکنار ہوگی جو اس تقاضے کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔

© rasailojaraid.com

ڈاکٹر اسرار احمد بطور داعی الی القرآن

عصرِ حاضر میں دعوت الی القرآن کے داعی میں جو صفات ہونی چاہئیں وہ کافی حد تک پاکستان کے اسلامی مفکر ڈاکٹر اسرار احمد میں موجود ہیں۔

اوّل: خلوص، نیک نیتی اور سنجیدگی بالفاظ قرآن "ابتغاء وجہِ اللہِ" (۱۳ / ۲۲)

دوم: "فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا" (۳۰ : ۴۳) کے تتبع میں یک جہتی اور یکسوئی۔

سوم: قرآن کے ساتھ وارفتگی، روحِ اسلام تک رسائی کی شدید تڑپ۔

چہارم: قرآنی تعلیمات پر عمل کا جذبۂ صادق "فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ" (۳ : ۱۵۹)

پنجم: "بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ" کے زیرِ اثر تبلیغ دین کا شدید احساس۔

ششم: زہد، تقویٰ اور صدق کے اوصاف پر پاکیزہ سیرت اور بے داغ کردار

ہفتم: ذاتی، مادی اور وقتی مفادات سے بالا، سستی شہرت، ریاکاری اور نمود و نمائش سے بے نیاز۔

ہشتم: حلال روزی پر قناعت اور کفایت شعاری۔

© rasailojaraid.com

نہم : شریعت کی تعبیر نو کا احساس و شعور

دہم : متدین اور مخلص طبقہ معاشرت پر دعوت کے مثبت اثرات

دعوت الی القرآن

ڈاکٹر صاحب کی دعوت کا علمی، تاریخی اور فکری تجزیہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ انہیں تاریخی عوامل اور ان کی اثراندازی کا ادراک حاصل ہے۔ فکری ابہام میں مبتلا ہو کر مسلمانوں کے کئی عالی دماغ ٹھوکر کھا چکے ہیں جس چیز کو وہ سنجیدگی کے ساتھ شریعت قرار دیتے رہے ہیں درحقیقت وہ تعبیر شریعت تھی۔ اصل چیز "CONCEPTUAL CLARITY" ہے۔ جس مفکر نے شریعت اور تعبیر شریعت کے درمیان فرق و امتیاز کا شعور حاصل کر لیا وہ صحیح معنوں میں راہنمائی اور رہبری کے منصب پر فائز ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کی دعوت کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ حقیقت کو پا لینے کے بعد اس کے اظہار کی قوت سے مالا مال ہیں۔ حکمت قرآن شمارہ فروری ۱۹۹۰ء کے صفحہ ۸۴ پر قرآن اور جہاد پر بحث کے دوران انہوں نے ان عوامل کی نشاندہی کی ہے جن کے ذریعے اسلام نے مملکت اور سلطنت کی شکل اختیار کر لی تھی جس کے نتیجے میں فرد و اجتماع کے ظاہر کے لیے قوانین و ضوابط اولیت اور مکارم اخلاق یا مواعظ حسنہ ثانوی حیثیت اختیار کر گئے۔ اس پر ان کا یہ تبصرہ علم افروز ہے "یہی وجہ ہے کہ جب اسلام مملکت اور سلطنت کے دور میں داخل ہوا تو اصل زور ایمان کے بجائے اسلام پر، یقین کے بجائے اقرار اور شہادت پر اور باطن سے بڑھ کر ظاہر پر ہو گیا۔ نتیجتاً قرآن حکیم کے بھی منبع ایمان اور سرچشمہ یقین ہونے کی حیثیت مؤخر اور نگاہوں سے اوجھل ہوتی چلی گئی اور کتاب قانون اور یکے از ادلۂ اربعہ ہونے کی حیثیت مقدم اور مرکز توجہ بنتی چلی گئی اور پھر جیسے جیسے مملکت اور سلطنت کے تقاضے پھیلتے گئے اور قانون کی عملداری وسیع ہوتی گئی قرآن مجید تو چار میں کے 'ایک' کی حیثیت میں پس منظر میں گم ہوتا چلا گیا اور توجہات حدیث اور فقہ پر مرتکز ہو کر رہ گئیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ علم اور حکمت کے میدان میں جو خلا اس طرح پیدا ہوا اسے پر کرنے کے لیے مصر و یونان کی جانب سے فلسفہ و منطق کی آندھیاں آئیں۔ نتیجۃً پورا عالم اسلام ارسطو کی منطق اور نو افلاطونی تصوف کی آماجگاہ بن کر رہ گیا۔ یہاں تک کہ فلسفہ و اصول اخلاق کے لیے بھی مسلمانوں کو اغیار کے سامنے کاسۂ گدائی پیش کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا! اور رفتہ رفتہ صورت یہ ہو گئی کہ قرآن نہ منبع ایمان رہا نہ سرچشمہ یقین، اور نہ مخزن اخلاق رہا نہ معدن حکمت۔ بلکہ صرف ایک ایسی کتاب مقدس بن کر رہ گیا جس کے الفاظ

© rasailojaraid.co
© rasailojaraid.co

یا تو حصولِ برکت اور ایصالِ ثواب کا ذریعہ بن سکتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کے کام آ سکتے ہیں۔"

کسی تحریک کی قوّت کا راز اس کے تصوّرات، نظریات اور افکار کی توانائی اور تازگی میں مضمر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریک ان افکار سے مالا مال ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں اسلام پر ان کا تبصرہ بڑا جاندار ہے۔ ایک پاکستانی مسلمان مفکّر کی حیثیت سے ان کی یہ نہایت عالمانہ، محققانہ اور جرأت مندانہ رائے ہے وہ لکھتے ہیں:

"گویا ہندوستان میں اسلام آیا ہی اس وقت جب وہ اپنی نشأۃ اولیٰ کے بعد زوالِ اوّل سے پوری شدّت کے ساتھ دوچار ہو چکا تھا۔ اور اس کی وحدتِ فکری بھی پارہ پارہ ہو چکی تھی اور وحدتِ ملّی بھی۔ چنانچہ ایک طرف عالمِ اسلام کے قلب میں عرب قوّت کا تقریباً خاتمہ ہو چکا تھا اور خلافتِ بنی عباس کا دیا چراغِ سحری کے مانند ٹمٹما رہا تھا اور پوری مملکت طوائف الملوکی کا شکار تھی۔ گویا بنی اسمٰعیل کے حق میں وعیدِ خداوندی "اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ" پوری طرح ظاہر ہو چکی تھی ____ اور دوسری طرف خلافتِ اسلامی کی وہ توحیدی شان ایک داستانِ پارینہ بن چکی تھی جس میں نہ دین و دنیا کے مابین کوئی دوئی تھی نہ مذہب و ریاست میں کوئی جدائی اور خدا کے جلال و جمال کے مظاہر جدا تھے نہ سلطانی و درویشی کے مصداق مختلف! ____ اور اس کی جگہ قیادت و سیادت اور رہنمائی و پیشوائی کے ضمن میں ملوک، احبار اور رہبان پر مشتمل وہ قدیم تثلیث پوری طرح رائج و نافذ ہو چکی تھی جو ایک اسلام کے سوا دنیا کی تمام تہذیبوں اور تمدّنوں کا جزوِ لاینفک رہی ہے اور جس سے پیشگی خبردار کیا تھا عہدِ اوّلین ہی میں حضرت عبداللہ ابن المبارکؒ نے اپنے اس حد درجہ فصیح و بلیغ شعر میں ؎

وَمَا اَفْسَدَ الدِّيْنَ اِلَّا الْمُلُوْكُ
وَ اَحْبَارُ سُوْءٍ وَ رُهْبَانُهَا

اس شعر کی اتنی ہی فصیح و بلیغ ترجمانی علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں کی ہے: ؎

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری"

ملوکیت نے کس طرح دین کو بگاڑا اس پر آیت "اِنَّ الْمُلُوْكَ" کی تفسیر میں علامہ اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار پیش کیے گئے ہیں:

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ اِنَّ الْمُلُوْکَ — سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر — پھر سُلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز — دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری
سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے — حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آزری!"

مدرسہ و خانقاہ کی منافرت پر نہایت بصیرت افروز بحث کی گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہندوستان میں اسلام علاقہ ماوراء النہر سے آیا تھا جہاں خود مذہبی حلقوں میں مدرسہ و خانقاہ کی تقسیم راسخ ہو چکی تھی اور ان کے مابین مسابقت ہی نہیں منافرت کا آغاز ہو چکا تھا اور جہاں مدارس میں حنفی فقہ، اشعری و ماتریدی عقائد، یونانی فلسفہ و منطق اور ان سب کے معجون مرکب علم کلام کا دور دورہ تھا، اور خانقاہوں میں وحدت الوجود کا سکّہ رواں تھا۔ لہٰذا اسلامی ہند میں مذہب کی عمارت انہی دو ستونوں پر استوار ہوئی یعنی ایک شدید حنفیت اور دوسرے وجودی تصوّف۔"

© rasailojaraid.

یہاں انہوں نے غلو فی الحنفیت اور بُعد عن حدیث الرسول پر قابل قدر تحقیق پیش کی ہے جسے خواجہ نظام الدین اولیاء اور شیخ الاسلام قاضی جلال الدین کے مابین مناظرہ کی مثال سے متحقق کیا گیا ہے۔

انہوں نے اپنی بحث کا نتیجہ فکر اس طرح پیش کیا ہے:

"اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ اسلامی ہند میں آغاز ہی سے دو حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ ایک ظاہری حکومت جس کا اقتدار یا زمین پر قائم تھا یا انسانوں کے جسموں پر، اور دوسری باطنی حکومت جس کا سکّہ قلوب کی دنیا میں رواں تھا۔ پہلی حکومت اصلاً ملوک و سلاطین اور امراء و عمائدِ سلطنت کی تھی اور ان کے ساتھ بطور تتمّہ یا ضمیمہ منسلک تھے ائمہ و خطباء، مدرسین و معلمین اور مفتی و قاضی حضرات، اور اس دنیا میں جیسے کہ عرض کیا گیا فقہ ہی کو گویا کل دین کی حیثیت حاصل تھی جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ متشددانہ ظاہر پرستی اور قانونی موشگافی کا دور دورہ ہو گیا اور رفتہ رفتہ دین و مذہب نے بالکل خشک قانونیت کی شکل اختیار کر لی۔" حکمتِ قرآن کے زیرِ تبصرہ شمارہ دل میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے جن تاریخی مباحث کو پیش کیا ہے وہ تحقیقی اور تخلیقی ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ پہلے متدین عالم ہیں جنہوں نے حقائق کا سخت محنت سے کھوج لگایا ہے اور پوری جرأتِ ایمانی کے ساتھ انہیں پیش کیا ہے۔

© rasailojaraid.